شان نزول اور فہم قرآن

محمد نجات اللہ صدیقی

تعارف موضوع

اس مختصر مضمون میں اس سوال پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے میں ''شان نزول'' کی کیا اہمیت ہے۔

''شان نزول'' ایک تہ در تہ (Multi Layered) تصور ہے۔ جب بھی ہم کسی تفسیر یا حاشیہ کے ساتھ ترجمہ قرآن پڑھتے ہیں ہمارے سامنے اس طرح کے بیانات آتے ہیں: یہ آیت فلاں قضیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کبھی کبھی کسی پوری سورہ یا اس کے بڑے حصے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کس موقع پر نازل ہوئی۔ ہر سورہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی یا مدینہ میں۔ یہ معلومات اس لیے دی جاتی ہیں کہ ان سے قرآن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

''شان نزول'' کی ایک اور سطح یہ ہوتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں حجاز اور اہل عرب کے وہ احوال سامنے رہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا تاکہ وہ ساری انسانیت کو زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ سکھائیں۔

قرآن کریم قیامت تک کے لیے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہدایت نامہ ہے۔ اسے سننے، پڑھنے، سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی دعوت صرف ہم مومنین کو نہیں ہر انسان کو دی گئی ہے۔[1] جو لوگ عربی جانتے ہوں وہ کلام الٰہی کو براہ راست پڑھیں گے اور جو لوگ عربی نہ جانتے ہوں وہ ان بے شمار ترجموں سے مدد لیں گے جو مختلف زبانوں میں

میسر ہیں اور جنھیں عوام وخواص کا اعتماد حاصل ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہر قرآن پڑھنے والے کے لیے اس کی ''شان نزول'' جاننا ضروری ہے۔ اگر ایسا ہے تو کس سطح پر اور کیوں۔ آج کی دنیا میں (اور آنے والے زمانہ میں) اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے فہم قرآن میں اس کا کیا رول ہوسکتا ہے؟

اس سوال کو لے کر ہم بیسویں صدی میں قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنے والے چند لوگوں کی رائیں نقل کریں گے تاکہ ہمیں مذکورہ بالا سوال کے ابعاد (Dimensions) کو سمجھنے کا موقع ملے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تفسیر تدبر قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''شان نزول سے متعلق میرا جو مسلک ہے اور جس کی میں نے اس کتاب میں پیروی کی ہے وہ میں اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں:

'شان نزول کا مطلب، جیسا کہ لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت اور کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسر موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدّ نظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو اور وہ امر یا امور جو کسی سورہ میں مدّ نظر ہوتے ہیں اسی سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں، لہٰذا اگر شان نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو۔

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی پیروی میں سررشتہ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا ورنہ تمہاری شان صحرا کے اس

مسافر کے مانند ہو جائے گی جو اندھیرے میں کسی چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و آثار کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہیے جو نظم قرآن کی موافقت کریں نہ کہ اس کے سارے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیں'۔

میں نے شان نزول کے معاملہ میں ٹھیک اسی طریقہ کی پیروی کی ہے۔ واقعات کو صرف انہی آیات کی تفسیر میں اہمیت دی ہے جن میں کسی واقعہ کی تصریح یا تلمیح ہے اور ان کو بھی ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے الگ کر کے لیا ہے جن کی تائید قرآن کے الفاظ یا اشارات سے نہیں ہوتی''۔ ۲

مذکورہ بالا بیان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ پہلے سورہ کے مرکزی مضمون اور آیات کے باہمی ربط و نظم کی روشنی میں کلام الٰہی کا محویٰ (Focus) متعین کیا جائے اس کے بعد علامہ فراہی کے الفاظ میں اس ''حالت اور کیفیت'' کو سامنے رکھا جائے ''جس پر وہ کلام برسر موقع حاوی ہوتا ہے''۔ ساتھ ہی قرآن کے طالب علم کو اس امر پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ اس ترتیب کو الٹ کر اگر ''شان نزول'' کی تلاش میں الجھے تو کلام الٰہی کے فوکس سے دور چلے جائیں گے۔ سورہ کے مرکزی مضمون اور نظم کے کلیدی فراہی تقررات کا تعلق کلام الٰہی کے اوپری اور عالم گیر پہلوؤں سے ہے جن کی تعیین کلام الٰہی کے اندر اسی کے متن (Text) سے کی جاسکتی ہے، اس کے خارجی عناصر کی مدد نہیں چاہیے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تفہیم القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کی ہر سورت دراصل ایک تقریر تھی جو دعوت اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا ایک

خاص پس منظر ہوتا تھا۔ کچھ مخصوص حالات اس کا تقاضا کرتے تھے۔ اور کچھ ضرورتیں ہوتی تھیں جنھیں پورا کرنے کے لیے وہ اترتی تھیں۔ اپنے اس پس منظر اور اس شان نزول کے ساتھ قرآن کی ان صورتوں کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعی نہیں سمجھے گا اور بعض باتوں کو الٹا سمجھ جائے گا اور قرآن کا پورا مدعا تو شاید کہیں اس کی گرفت میں آئے گا ہی نہیں۔''[۳]

آگے چل کر تفہیم القرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''پیش نظر چیز یہ تھی کہ خالص کلام الٰہی بغیر کسی دوسرے کلام کی آمیزش یا شمول کے اپنی مختصر صورت میں مرتب ہو جسے بچے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، عامی، عالم، سب پڑھیں۔ ہر زمانے میں اور ہر حالت میں پڑھیں اور ہر مرتبۂ عقل و دانش کا انسان کم از کم یہ بات ضرور جان لے کہ اس کا خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔''[۴]

مولانا مودودی کے پہلے اقتباس کو جو دیباچہ تفہیم القرآن سے ماخوذ ہے دوسرے اقتباس کی روشنی میں سمجھا جانا چاہیے جو تفہیم کے مقدمہ سے لیا گیا ہے۔ اصل اہمیت کی بات مقدمہ والی بات ہے۔ اصل سمجھنے کی چیز کلام الٰہی کا وہ فحویٰ (Import) ہے جو زمان و مکان سے بالا بھی ہے اور ہر زمان و مکان سے یکساں وابستہ بھی ہے۔ اس عالم گیریت اور ابدیت کے پس منظر میں سرزمین عرب کو ساتویں صدی عیسوی کے ان ۲۳ برسوں میں جن میں قرآن نازل ہوا ایک خصوصیت حاصل رہی جو کسی اور زمانہ میں کسی اور سرزمین کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سرزمین کے اس زمانہ کے بعض وقائع کی نزول قرآن سے نسبت رہی ہے۔ پہلی عبارت میں جو دیباچۂ تفہیم سے لی گئی ہے مولانا مودودیؒ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس پس منظر کو سمجھے بغیر فہم قرآن ممکن نہیں۔ مگر ان کے ذہن میں

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ فہم قرآن کا عمل ہر زمانہ میں مختلف مقامات کے مختلف افراد انسانی اپنی اپنی زندگی میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی غرض صرف اس سے نہیں پوری ہوگی کہ قرآن کے پیغام کو ان لوگوں اور ان حالات کی نسبت سے سمجھ لیں جن کو یہ ابتداءً سنایا گیا تھا۔

حسن البناءؒ

حسن البناء شہید لکھتے ہیں:

''ایک اخوانی نے ایک مرتبہ مجھ سے سوال کیا: قرآن کریم کی سب سے افضل تفسیر اور اس کو سمجھنے کا سب سے بہتر طریقہ کیا ہے؟ میرا جواب تھا ''تمہارا دل''۔ یقیناً مومن کا دل کتاب اللہ کی سب سے افضل تفسیر ہے۔ قرآن کو سمجھنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ قاری تدبر اور خشوع کے ساتھ اس کی تلاوت کرے، اس سے رشد و ہدایت اور راست روی چاہے۔ تلاوت کے وقت منتشر افکار کو جمع رکھے۔ ساتھ ہی سیرت نبویؐ سے بھی واقف ہو۔ یعنی اسباب نزول اور سیرت نبوی کے مختلف مقامات سے اس کے ربط سے آگاہ ہو۔ اس سے اسے قرآن کے صحیح فہم میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کے بعد جب وہ تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو اس کا مقصد صرف کسی دقیق لفظ کا معنی یا کسی مخفی ترکیب سے واقفیت حاصل کرنا یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہو جس سے وہ کتاب اللہ کا صحیح فہم حاصل کر سکے۔ یہ چیزیں محض فہم قرآن میں معاون ہوتی ہیں۔ فہم تو درحقیقت نور ہوتا ہے جو دل کی گہرائی میں روشن ہوتا ہے۔'' ۵

امام شہیدؒ نے بھی شان نزول جاننے کو ثانوی اہمیت دی ہے ان کے نزدیک فہم قرآن کے لیے زیادہ اہمیت رکھنے والی چیزیں قرآن پڑھنے والے کی نیت، یکسوئی، خشوع و

انابت وغیرہ قلبی کیفیات کو حاصل ہے۔ عقل و منطق ،لغت اور قواعد، زمان و مکان سے رشتے ...... پس منظر فراہم کرتے ہیں ۔قرآن فہمی میں ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس پس منظر کے ساتھ ،اور مطلوبہ قلبی کیفیات کے ساتھ، کلام الٰہی کے حضور حاضر ہوں، پھر جس بات پر دل جھکے اسے اختیار کریں۔

حسن البنا ایک عظیم اسلامی تحریک کے بانی تھے جس کے افراد فہم قرآن کریم کا نور حاصل کر کے اس روشنی کو دنیا میں پھیلانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ خود ہدایت الٰہی کے مطابق زندگی گزاریں اور سارے انسان انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہدایت الٰہی کو رہنما بنائیں۔ اتنی زبردست اہمیت کے حامل فہم قرآن میں قاری کی قلبی کیفیات کو قرآن فہمی کے روایتی مطلوبات ،جن میں شان نزول جاننا بھی شامل رہا ہے، فوقیت دینا دوررس اہمیت رکھتا ہے۔ اس اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ بدلتی ہوئی انسانی صورت حال (Human Situation) کے باوجود قلب انسانی کا خالق کائنات کی طرف رجوع و خشوع ایک اٹوٹ رشتہ رہا ہے جسے کسی حد تک زمان و مکان سے بلند قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وجہ ہے کہ زمان و مکان کی قید میں دی جانے والی ہدایات سے زمان و مکان سے بلند نور حاصل کرنے میں حسن البنا شان نزول وغیرہ سے زیادہ دل پر بھروسہ کرتے ہیں؟

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

گزشتہ صدی میں فہم قرآن کے موضوع پر سوچنے اور لکھنے والوں میں علامہ اقبال کا نام بھی نمایاں ہے۔ ''شان نزول'' کی نسبت سے ان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں جو ''اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو'' پر ان کے مشہور خطبات میں سے چھٹے خطبہ سے ماخوذ ہیں:

> ''اپنے موجودہ مقصد کی مناسبت سے ضرورت ہے کہ ہم خالصۃً قانونی نوعیت کی حدیثوں اور ان روایات کے درمیان فرق کریں جن کا تعلق قانون سے نہیں ہے۔ پہلی قسم سے متعلق ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک قبل اسلام کے عرب رواج پر مشتمل

ہیں جن میں سے بعض کو جیوں کا تیوں باقی رہنے دیا گیا تھا اور بعض دوسروں میں رسول اللہؐ نے کچھ ترمیمات کی تھیں۔ اس امر کی پوری تحقیق دشوار ہے کیوں کہ ہمارے ابتدائی دور کے مصنفین ہر معاملہ میں قبل اسلام رواج کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ بھی معلوم کرنا مشکل ہے کہ جن چیزوں کو رسول اللہؐ نے جیوں کا تیوں باقی رہنے دیا تھا، خواہ صریح فرمان کے ذریعہ یا خاموش قبولیت کے ذریعہ، ان کی عالم گیر اور دائمی تطبیق مقصود تھی۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بصیرت افروز بحث کی ہے۔ میں یہاں ان کے کلام کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ شاہ ولی اللہ کے مطابق نبیﷺ کا سکھانے کا طریقہ عام طور پر یہ تھا کہ کسی بھی نبی کے ذریعہ جو احکام آتے ہیں ان میں لوگوں کے عادات واطوار اور خصوصیات کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے جن کی طرف وہ براہ راست بھیجا گیا ہو۔ مگر جس نبی کا ہدف جامع عالم گیر اصول ہوں وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ہر قوم کے لیے الگ الگ اصول بیان کرے، نہ ہی اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ ہر قوم کو اپنا ضابطۂ اعمال مرتب کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص مجموعۂ افراد کی تربیت کرتا ہے اور پھر ان کو ایک عالم گیر شریعت کی تشکیل کے لیے بنیاد بناتا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ ان اصولوں کو ابھارتا ہے جو سارے انسانوں کی سماجی زندگی میں جاری وساری ہوں۔ وہ ان اصولوں کو اپنے براہ راست مخاطب گروہ کو درپیش عملی مسائل پر ان کے عادات واطوار کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے منطبق کرتا ہے"۔[۶]

علامہ اقبال کے نزدیک اصل چیز تو وہ جامع اور عالم گیر اصول ہیں جو ہر زمانہ، ہر مقام، ہر قوم...... کے لیے رہنما اصول بن سکیں لیکن چوں کہ کار نبوت کا ایک خاص زمانہ

میں ایک خاص مقام پر ایک خاص قوم کے اندر انجام دینا انسانی صورت حال (Human Situation) کا حتمی پہلو ہے لہٰذا اصولوں کی تطبیق یا ان کی عملی تعبیر میں زمانی، مکانی اور قومی عناصر لازماً داخل ہو جاتے ہیں۔ عصر نبوت گزر جانے کے بعد ان عناصر کی پہچان اور ہدایت الٰہی کے جامع اور عالم گیر اصولوں کو جو ہر زمانہ میں ہر مقام پر ہر فرد ہر قوم کے لیے رہنما بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں علیٰحدہ کر کے پہچاننا فہم قرآن کا جوہر ہے۔

علامہ اقبال کا یہ اقتباس ان کے اس لکچر سے لیا گیا ہے جس میں انھوں نے اجتہاد کی ضرورت، اہمیت اور نوعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سیاق میں یہ کہا جا سکتا ہے اسلامی ورثہ کے جوہری، الٰہی اور ابدی عناصر کو ان عناصر سے الگ کر کے دیکھنا ان کے نزدیک اجتہاد کی شرط لازم ہے جو عناصر کہ زمان و مکان اور مخاطب قوم کے عادات و اطوار اور رسم و رواج سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر عرفان احمد خان

ڈاکٹر عرفان احمد خان اپنی انگریزی تفسیر ''قرآن میں بصیرت، آیاتِ الٰہی پر غور و فکر کے بعض نتائج'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''چوتھا نکتہ یہ ہے کہ مومنین کو ہمیشہ کلام الٰہی کی صورت میں دی گئی ہدایت خداوندی سے بلاواسطہ، راست تعلق رکھنا چاہیے۔ انھیں اسے ہمیشہ تازگی کے ساتھ پڑھتے رہنا چاہیے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کا طریقہ سنت نبویؐ سے ہدایت حاصل کرنے کے طریقہ سے کتنا مختلف ہے۔
>
> یہ بڑی غلطی ہوگی کہ کتاب کو ہمیشہ ان انسانی احوال کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے جن میں وہ پہلی بار نازل ہوئی تھی، یا یہ کہ کتاب کو ان لوگوں کے ذہن سے سمجھنے کی کوشش کی جائے جو اس کے اولین مخاطب تھے۔ یہ طریقہ تو نبی ﷺ کی سنت کے فہم کے لیے

اختیار کرنا چاہیے۔ سنت کے ذریعہ کلام الٰہی کی صورت میں دی گئی ہدایت خداوندی کو ٹھوس عمل کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ وہ (سنت) انسانی زندگی کے ایک مخصوص صورت حال میں اس فہم کے مطابق، اور اس تفہیم کی روشنی میں، (کلام الٰہی کے صورت میں دی گئی ہدایت خداوندکی) تطبیق کا نام ہے، جو مومنین کی پہلی نسل کو میسر آئی۔ لیکن ہمارے لیے یہ فرض کرنا لازم ہے کہ کلام الٰہی کی صورت میں دی جانے والی ہدایت خداوندی جو تمام انسانوں کو، ان کی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں یکساں مخاطب کر رہی ہیں، انسانیت کے ہر مرحلہ میں اسی طرح عمل کا جامہ پہن سکے گی جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا، بعد میں آنے والی تمام مومن نسلیں کلام الٰہی سے براہ راست تعلق رکھنے پر مامور ہیں، اگر چہ ان نسلوں کو مختلف سماجی حالات سے سابقہ پڑے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اندر ایسی نئی صلاحیتیں رونما ہوں جن سے امت کو کتاب کے فہم میں مدد مل سکے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کا ہر خطا سے پاک، جامع، اور مکمل عملی جامہ صرف سنت میں ہے۔ صرف سنت کے بارے میں خدا نے یہ ذمہ داری لی ہے کہ (اس کی ہدایات کو) عملی جامہ پہنانے کا عمل اس قدر مکمل اور اعلیٰ درجہ پر انجام پائے گا جو انسانی طور پر ممکن ہو تا کہ آیندہ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ بن کر سامنے رہے"۔[۷]

اوپر کے اقتباس سے واضح ہے کہ تین چیزوں کے درمیان فرق کیا جارہا ہے:

۱۔ کلام الٰہی کی صورت میں دی گئی ہدایت۔

۲۔ سنت نبوی کی صورت میں ایک خاص زمان ومکان میں ایک خاص قوم کے اندر اس ہدایت کی عملی تعبیر۔

۳۔ بعد کے زمانوں میں، مختلف مقامات پر، مختلف قوموں کے اندر اس ہدایت

پر عمل کی خاطر اس کا فہم۔

انسانی صورت حال (Human Situation) کچھ ایسی ہے کہ اول الذکر، یعنی خدا کی دائمی اور عالم گیر ہدایت کا اظہار اور اس کی عملی تشریح زمان ومکان سے آزاد ہو کر ممکن نہیں ہے۔ عرفان احمد خاں اس کو سمجھنے کے لیے ثانی الذکر، یعنی ساتویں صدی کے عربوں کے درمیان اس ہدایت پر عمل کرنے اور کرانے سے جو نمونہ سامنے آتا ہے اس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لیکن جس چیز کی ہمیں اور آئندہ تمام لوگوں کو ضرورت ہے وہ اول الذکر کا فہم ہے۔ اللہ کی طرف سے ہمیں یہ فہم حاصل کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ عرفان احمد خان کا خیال ہے کہ زمانہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ہماری قرآن سمجھنے کی استعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ ہماری نظر اسی فہم پر مرکوز رہنی چاہیے، اس فہم کو اس جامہ کا پابند نہ بنانا چاہیے جو ایک خاص قوم کے اندر نازل ہونے کی وجہ سے اسے پہننا ناگزیر تھا۔ ''شان نزول'' یا تاریخی اسباب واحوال سنت کے سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔ ان تفصیلات سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کلام الٰہی کی صورت میں دی گئی ہدایت خداوندی کو، جو اصلاً زمان ومکان سے بلند ہے، اس خاص قوم میں ایک خاص زمانہ میں بدرجہ تمام وکمال خود اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے کس طرح عمل کا جامہ پہنایا۔ مگر خود اصل ہدایت شان نزول سے بے نیاز ہے۔

''شان نزول'' کے بارے میں آراء کا تقابلی مطالعہ

آپ نے دیکھا کہ شان نزول کی نسبت سے ان چند سوچنے والوں نے ایک دوسرے سے قدرے مختلف رویے اختیار کیے ہیں۔ ایک طرف مولانا مودودی اور حسن البناء شہید ہیں جن کی نظر ''شان نزول'' کے روایتی مفہوم پر ہے۔ البتہ اس بارے میں ان کی رائیں ایک نہیں ہے کہ فہم قرآن میں اس کا دخل کس قدر ہے۔ دوسری طرف علامہ اقبال اور عرفان احمد خاں ہیں جن کی نظر مسئلہ کے ایک دوسرے ہی بُعد (Dimension) پر ہے۔ مولانا امین احسن کو اندیشہ ہے کہ روایتی معنی میں ''شان نزول'' کے تتبع میں ہم اتنا

دور نہ نکل جائیں کہ کلام الٰہی کا فوکس ہماری نظر سے اوجھل ہو جائے۔ اور ان کے استاذ علامہ حمید الدین فراہیؒ کے نزدیک اس فوکس کی تلاش خود نص (Text) میں کی جائے گی نہ کہ اس صورت حال میں جس میں نص کا وقوع عمل میں آیا۔ قرآن کریم کی آیات کا نظم اور ربط باہم، نیز کسی سورۃ کا مرکزی مفہوم خود قرآن کے مطالعہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے، اس کے لیے کسی خارجی معلومات اور نزول قرآن کے دقت کی صورت حال وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر چہ ان کی نظر سند کے ان ابعاد پر نہیں معلوم ہوتی جو اقبال اور عرفان احمد خاں کا مرکز توجہ ہیں لیکن ان کا طریقۂ فہم قرآن ان جیسے لوگوں کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہو سکتا ہے۔

نتائج بحث

اس محدود جائزہ اور مختصر غور وفکر سے بھی چند اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے القرآن **لایفنی عجائبہ**۔

دیکھیے ''شان نزول'' جیسے روایتی موضوع میں بھی کیا کیا گل کھلے، کیا نئے پہلو سامنے آئے! گزشتہ صدی میں کتنے ہی دوسرے علماء اور دانش وروں نے فہم قرآن کی کوشش کی اور اپنے نتائج فکر ہمارے سامنے رکھے۔ اس مقالہ نگار کو جو مختصر سا وقت ملا ان میں ان لوگوں کے کام تک بھی رسائی نہ ہو سکی جو اس کے زیر مطالعہ آچکے ہیں مثلاً جرمن نو مسلم دانش ور اور مترجم قرآن محمد اسد، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کجا یہ کہ دوسرے ملکوں میں دوسری زبانوں میں لکھی جانے والی تفسیروں کا جائزہ لیا جا سکتا۔ جی چاہتا ہے کوئی توانا ہاتھ اس موضوع پر قلم اٹھائے تاکہ ہمیں فہم قرآن کے ضمن میں ''شان نزول'' کے بارے میں مزید بصیرت حاصل ہو سکے۔

یہ تو ہم عصروں کے مطالعہ کی بات تھی خود قدماء کے کارناموں پر اس موضوع کی نسبت سے از سر نو کام ہونا چاہیے۔

اگر چہ فہم قرآن شان نزول سے بلند ہو مگر وہ اس سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ عہدِ رسالت کے حجاز میں گزاری جانے والی زندگی، اس سے پہلے عربوں کے احوال، اوراس کے فوراً بعد کی تاریخ پر جتنا مواد میسر ہےاس پر بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہے، اس سے مزید گہرائی اور گیرائی پیدا ہو اور اگر جدید علم الآثار (Archaeology) وغیرہ کی مدد سے نیا مواد حاصل کیا جاسکتا ہو تو ضرور کیا جائے۔ آخر الذکر مفکر کے نزدیک اس سے سنت کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی اور ظاہر ہے کہ سنت کی سمجھ قرآن فہمی میں معاون ہوسکتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک، شاہ ولی اللہ کے نظریہ کی روشنی میں، اس سے قرآن کے ابدی اور دائمی اصولوں اور اس کی عربی تطبیق کے درمیان فرق کیا جاسکے گا۔ حسن البناؒ کے نزدیک اسی سے قلب مومن پر نور الٰہی کی صورت میں فہم قرآن کے القاء کے لیے زمین ہموار ہوگی۔ مولانا مودودی کے نزدیک ان تفصیلات کے بغیر صحیح تفسیر ممکن نہیں اور مولانا امین احسن اس خطرہ کے باوجود کہ آدمی ان تفصیلات میں الجھ کر اصل فحوائے کلام سے دور نہ ہوجائے، اور اپنے اس مشورہ کے باوجود کہ ان تفصیلات میں سے اخذ وترک کے لیے سورہ کے مرکزی مضمون اور نظم قرآن کو بنیاد بنایا جائے (نہ کہ اسناد اور درجۂ حدیث کو)، شان نزول جاننے کی یک گونہ ضرورت سے انکاری نہیں ہیں۔

ہم نے مضمون کے آغاز میں جو سوالات اٹھائے تھے ان میں سے اکثر کے جواب ابھی باقی ہیں، اور جن سوالات کا جواب مذکورہ بالا مفکرین کی رایوں کی روشنی میں سامنے آیا ہے ان پر بھی کما حقہ بحث نہیں کی جاسکی ہے۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں، پہلی یہ کہ یہ جائزہ بہت محدود ہے، تشفی بخش بحث کے لیے علماء اور مفکرین کی ایک بڑی تعداد کا مطالعہ ضروری ہے جو کسی ایک ملک کے باشندوں تک محدود نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اوپر ہم نے جس تناؤ (Tension) کا ذکر کیا ہے، یعنی زمان ومکان سے مقید نزول ہدایت اور زمان ومکان کی قید سے آزاد فہم ہدایت کے درمیان پایا جانے والا تناؤ، اس کے بعض ابعاد ایسے ہیں جن کا ابھی ذکر نہیں آیا۔ انسانی نفسیات، اس کے سماج کی بدلتی ہوئی ساخت، اس کے ماحول (Environment) میں جاری تبدیلیاں وغیرہ عوامل کو فہم ہدایت اور تطبیق ہدایت میں کیوں، کیسے اور کتنا دخل ہے ان مسائل کی طرف تو ابھی ہماری

توجہ مبذول ہی نہیں ہوسکی ہے۔ خود ان کا ذکر اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اس کام میں سماجی علوم کے ماہرین کی خصوصاً اور دوسرے علوم جدیدہ کے ماہرین کی بالعموم، فعال شرکت کے بغیر اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موضوع 'شان نزول' اور فہم قرآن، کے دائرہ میں الٰہیات، انسانیات، اور وہ تمام علوم آگئے جن کا تعلق کائنات اور اس کے ثوابت و متغیرات سے ہے۔ پھر بچا کیا؟

حواشی ومراجع

۱۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں: سورۂ نحل آیت ۴۴، اور سورۂ سبا آیت ۴۶۔

۲۔ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۷۳ء، جلد اول، ص ق۔

۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی، ۱۹۶۷ء (نواں ایڈیشن)، جلد اول، ص ۹۔

۴۔ حوالہ سابق، ص ۲۷۔

۵۔ امام حسن البنا شہید، علم التفسیر کے چند بنیادی مسائل، (ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی)، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ص: ۳۱-۳۲۔

۶۔ Dr. Sir Mohammad Iqbal, *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore, Sh. Mohammad Ashraf, 1960, pp.171-72

۷۔ Irfan Ahmad khan, *Insight into Quran, Reflections upon Divine Signs*, Genuine Publications, New Delhi, 1999, p.10.

☆